اقبال اور مغربیت کے اثرات

ڈاکٹر وزیر آغا

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سرسید احمد خاں' جب مغربیت سے آشنا ہوئے تو انہوں نے اسے بطور ایک پیکج (PACKAGE) درآمد کرنے کا پروگرام وضع کر لیا۔ یعنی مغرب کی فکری جہات کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کے اسلوب حیات کے ہاتھوں میں بھی پروانہ راہداری تھما دیا اور اس کا فوری ردعمل بھی ہوا۔ بالخصوص اکبر الہ آبادی کے قلم سے۔ ع مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے' والا شعر ٹپک پڑا جس کی گونج نصف صدی تک پورے برصغیر میں سنائی دیتی رہی۔

مگر جس طرح سرسید احمد خاں نے 'پیروی مغربی' کی دھن میں مغربی فکر اور تہذیب' دونوں کو خوش آمدید کہا تھا اسی طرح' ردعمل کے طور پر' اکبر الہ آبادی نے 'استرداد مغربی' کی دھن میں دونوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ مگر اقبال نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی۔ اقبال نے کہا کہ مغربی علوم کو مسترد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔۔۔ اس لئے بھی کہ آج مغرب اپنے جن علوم پر نازاں ہے ان میں سے بیشتر کا ابتدائی پیکر مشرق وسطی کے مسلمانوں ہی کے ہاں مرتب ہوا تھا اور وہیں سے یہ علوم سینہ بہ سینہ اور دست بہ دست مغرب کے حکماء تک پہنچے تھے۔ البتہ مغربی تہذیب کو درآمد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ جو آشیانہ شاخ نازک پر بنایا جائے وہ کبھی پائیدار نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اقبال نے مغربی فکر کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے خرد پر مغرب کے کامل انحصار کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا اور بالخصوص اپنی شاعری میں عقل کی نارسائی کو عشق کی جست خیزی کے مقابلے میں کمتر قرار دیا تاہم انہوں نے خرد کو مسترد ہرگز نہیں کیا جیسا کہ بعض کرم فرماؤں کا خیال ہے۔ اقبال کے نزدیک خرد کی حیثیت اس بیساکھی کی سی تھی جس کے بغیر انسان اپنے سفر کے ابتدائی مراحل میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب کہ عشق ایک ایسا ذریعہ تھا جس کے بغیر وہ اپنے سفر کی آخری منازل کو طے کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں کہ صدہا منزل تک ہرن کے نقوش پا کی رہنمائی میں سفر کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ایک منزل تک نافہ آہو کی رہنمائی میں سفر کیا جائے۔ اقبال' مولانا روم کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں مگر وہ ساتھ ہی نقوش پا کی اہمیت

سے انکار نہیں کرتے۔ اقبال کا یہ خیال ہے کہ سائنسی انداز میں فطرت کا مشاہدہ کرنے والا شخص (اور یہاں اقبال واضح طور پر مغربیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں) اس شکاری کی طرح ہے جو ہرن کے نقوش پا کے تعاقب میں بڑھ رہا ہو لیکن عرفان کے حصول کے لئے اس شخص کی یہی پیاس اس مقام تک اسے ضرور لے جائے گی جہاں نقوش پا کے بجائے نافہ آہو کی خوشبو اس کی رہبر بن جائے گی۔ غور کیجئے کہ عرفان کے حصول کے لئے اقبال نے 'نقوش پا' اور 'نافہ آہو' کو دو متبادل راستے متصور نہیں کیا بلکہ انہیں ایک ہی سفر کے دو پڑاؤ قرار دیا ہے۔ مغربیت کو قبول یا رد کرنے کے معاملے میں بھی اقبال کا یہی رویہ ہے۔ وہ مغربیت کو 'نقوش پا' کا درجہ دے کر قبول تو کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ روحانی طور پر اونچا اٹھنے کے لئے نقوش پا کو ایک مقام پر ترک کر کے عشق کی جست سے خود کو ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مغربیت کو ایک ایسی تہذیب قرار دیتے ہیں جو چھونے' سونگھنے' پرکھنے اور تجزیہ کرنے پر مائل ہے جب کہ مشرقیت کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ایک ہی نظر میں سب کچھ "دیکھ لینے" پر قادر ہے۔

اقبال کے بہت بعد مغرب کے ایک مفکر نے کہ کولن ولسن جس کا نام ہے' اقبال کے اس انداز فکر کی توثیق ایک اور زاویئے سے کی۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر ایک نابینا شخص اور ایک آنکھوں والے شخص کو کسی کمرے میں پندرہ منٹ کے لئے بند کرنے کے بعد پوچھا جائے کہ انہوں نے کمرے میں کیا دیکھا تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ نابینا شخص تو کمرے کی تمام تفاصیل بیان کر سکے گا کیونکہ باصرہ کی عدم موجودگی میں وہ کمرے کی جملہ اشیاء کو چھو کر' ان کی پیمائش کر کے' انہیں سونگھ چکھ کر' الٹ پلٹ کر کے ان کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرے گا جب کہ آنکھوں والا کمرے کی تفاصیل کے معاملے میں شاید بالکل کورا ہو گا کیونکہ اسے اس کارروائی کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ وہ پورے کمرے کی تصویر پیش کرنے پر تو قادر ہو گا مگر اس کی جزئیات کو پیش نہ کر پائے گا۔ دوسری طرف نابینا شخص جزئیات کے معاملے میں تو ایک اتھارٹی تسلیم ہو گا مگر پورے کمرے کی تصویر پیش کرنے میں ناکام ہو جائے گا۔ کولن ولسن لکھتا ہے کہ ہم مغرب والے اس اندھے شخص کی طرح ہیں جو اس کائنات کو ٹٹول کر اس کے بارے میں جاننے کی کوشش میں ہے جب کہ مشرق والے کائنات کو ایک نظر میں 'دیکھ لینے' کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اقبال کا قصہ یہ ہے کہ وہ کمرے کو تمام و کمال جاننے کے لئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان پہلے تو ایک نابینا شخص کی طرح اس کی تفاصیل حاصل کرے اور پھر ایک بینا شخص کی طرح اس کی کلیت یا TOTALITY کا تصور قائم کرے۔ مغربیت کے سلسلے میں بھی اقبال کا یہی تصور ہے

کہ اس کے استقرائی عمل سے فائدہ اٹھایا جائے اور پھر وہبی سطح کی جست کا تجربہ کیا جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر انسان محض استقرائی عمل تک محدود رہے گا تو ایک مادی اسلوب حیات سے آگے قدم اٹھا نہ پائے گا جیسا کہ مغرب والوں کے معاملے میں ہوا ہے اور اگر وہ استقرائی عمل میں جتلا ہوئے بغیر استخراجی رویئے کو اپنائے گا تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ کسی گڑھے میں جا گرے گا۔ گویا نافہ آہو کی رہبری میں زقند لگانے سے پہلے نقوش آہو کی معیت میں سفر کرنا بہت ضروری ہے۔ اقبال کی فکر میں سب سے اہم کروٹ یہی نظر آتی ہے کہ وہ مغرب کے فکری نظام کو مسترد نہیں کرتے مگر آگے دیکھنے کے لئے مغربی فکر کے ٹیلے پر کھڑا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ کو اس مغربی مفکر کی بات تو یاد ہو گی جس نے کہا تھا کہ میں ایک کوتاہ قد آدمی ہوں مگر دوسروں کے مقابلے میں محض اس لئے زیادہ دور تک دیکھ سکتا ہوں کہ میں ایک دراز قد نابینا شخص کے شانوں پر بیٹھا ہوا ہوں۔ دیکھا جائے تو یہی رویہ اقبال کے بہت سے تصورات کی تشکیل میں بھی نظر آ سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اقبال کے "مرد مومن" کے تصور کو لیجئے۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ اقبال کا یہ تصور نطشے کے فوق البشر سے مستعار ہے۔ عام اس سے کہ فوق البشر کا تصور عبدالکریم جیلی اور رومی کے ہاں بھی موجود ہے اور اقبال ان مفکرین سے متاثر بھی ہیں نیز مغربی فکر میں فوق البشر کی پرچھائیں شوپن ہار کے "نابغہ" کارلائل کے "ہیرو" اور ویگنر کے "سگفریڈ" میں بھی ملتی ہے جن کا علم اقبال کو یقیناً تھا' اقبال کا اس ضمن میں نطشے کے تصور سے نسبتاً زیادہ متاثر ہونا اس لئے زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کے "مرد مومن" کی ایک خاص صفت وہ قوت اور محرک ہے جس کا مظاہرہ نطشے کے فوق البشر کے معاملے ہی میں ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نطشے کے فوق البشر کے پس منظر میں 'خیال' پر 'جبلت' کی فوقیت کا تصور بہت واضح تھا۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس نے اپنے فوق البشر کی تشکیل میں شوپن ہار کی "زندہ رہنے کی خواہش" یعنی WILL TO LIVE کو "قوت حاصل کرنے کی خواہش" WILL TO POWER کے تابع کر دیا تھا۔ اقبال کو "قوت" سے عشق تھا۔ وہ فرد اور ملت' دونوں کے معاملے میں انفعالیت کو ناپسند اور قوت کو پسند کرتے تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے نطشے کے فوق البشر کے اس خاص وصف کو سراہا مگر پھر نطشے کے اس اندھے' قوی الجثہ فوق البشر کے شانوں پر کھڑے ہو کر انہوں نے "مرد مومن" کے تصور کی تشکیل کی جو دور دور تک دیکھنے پر قادر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کے مرد مومن میں نہ صرف پوری کائنات کا جلال موجود ہے' نہ صرف وہ منزل کوش ہے اور منزل تک پہنچنے کی مسلسل تگ و دو کرتا ہے بلکہ وہ عاشق صادق بھی ہے اور یوں ایک ایسی

روحانی قوت سے آشنا ہے جس سے نطشے کا فوق البشر واقف نہیں تھا۔ دیکھنے کی بات ہے کہ اقبال مغربیت کو مسترد نہیں کرتے مگر وہ ایک مقام پر اس کے نقوش پا کو ترک کر دیتے ہیں اور پھر نافہ آہو کی خوشبو کے زیر اثر سفر کرنے لگتے ہیں اور ان کے ہاں قوت کے ارتکاز کی علامت یعنی فوق البشر منقلب ہو کر مرد مومن کا روپ دھار لیتا ہے جو جسمانی قوت کے علاوہ روحانی قوت کی علامت بھی ہے۔

مغربیت کے اثرات اقبال کے تصور زماں میں بھی ملتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال برگساں کے زمان مسلسل یعنی DURATION کے تصور سے متاثر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی اقبال نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ برگساں تک مغرب کا تصور زماں زیادہ تر تاریخی یا DIACHRONIC نظر آتا ہے جس میں وقت "ماضی' حال اور مستقبل" میں بٹ کر ایک سیدھی لکیر پر گامزن ہے۔ برگساں نے مرور زماں کے اس تصور میں زمان مسلسل کے تصور کا اضافہ کیا اور کہا کہ زماں میں تینوں زمانے بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ برگساں کے تصور زماں کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے مرور زماں کے تصور کو مسترد نہیں کیا بلکہ اس کی ایک ارتقائی صورت دکھائی جس میں تینوں زمانے یکجا تھے۔ اقبال کو برگساں کا یہ تصور اچھا لگا کیونکہ اس کی روایت مشرقی فکر بالخصوص تصوف میں پہلے سے موجود تھی۔ اقبال تحرک اور تبدیلی کے اس قدر والہ و شیدا تھے کہ خود کو زماں کے کسی نپے تلے قدموں سے چلنے کے میکانکی انداز کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مغرب کے مرور زماں کے تصور میں بھی (جو ماضی' حال اور فردا کی ایک لکیر سی بناتا تھا) جست یا زقند کے تصور کا اضافہ کیا اور اس ضمن میں حوالہ نظام کے طغرہ (یعنی جست) کے تصور کا دیا جس کے مطابق زماں ایک نقطۂ مکانی سے دوسرے نقطۂ زمانی تک (جو اس سے متصل ہے) سفر نہیں کرتا بلکہ ان دونوں کے درمیان جو کھائی یا خندق ہے' اسے ایک زقند سے عبور کر جاتا ہے۔ زماں کا یہ حرکی تصور اقبال کو عزیز ہے۔ مگر اس کے بعد وہ زمان مسلسل کی گرہیں کھولتے ہیں اور ارتکاز کی ایک ایسی کیفیت کو سامنے لاتے ہیں جو برگساں کے زمان مسلسل سے مشابہ تو ہے مگر اپنے اندر ایک تخلیقی شان بھی رکھتی ہے اصلاً تجلی ذات کی یہ کیفیت صفت گویائی سے لیس ہے۔ لہٰذا وہ صوفی کی طرح جلوہ مست نہیں ہوتے یعنی اپنی انفرادیت سے دست کش نہیں ہوتے بلکہ ذات لامحدود کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی خودی کا اثبات کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ رویہ تخلیقی اور جمالیاتی ہے' صوفیانہ نہیں ہے۔

خودی کا ذکر آیا ہے تو اقبال کے اس تصور کا حوالہ ضروری ہے جو فرد کی انفرادیت کا

اعلامیہ ہے۔ مغربیت نے فرد کی انفرادیت کے تصور کو بہت اچھالا ہے اور اقبال نے بھی اپنے فکری نظام میں اسے شامل کیا ہے مگر پھر اسے "بے خودی" کے تصور سے ہم آہنگ کر کے اپنے اس بنیادی رویہ کو بھی پیش کر دیا ہے جو مغربی فکر کی اساس کو مسترد نہیں کرتا بلکہ اس پر اپنی ایک الگ عمارت کھڑی کرتا ہے۔ آج سے چند روز پہلے سویڈن میں سویڈش رائٹرز یونین کی کانگرس میں جو مقالہ میں نے پیش کیا اس میں اقبال کی اس فکری جہت کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے میں اپنے اس مقالے سے ایک مختصر سا اقتباس درج کرتا ہوں :

In Western philosphy the individual consciousness highlighted by such concepts as logo_centrism, Cogito, logos or the intentional phenomenon of the ego is considered very important. Even in "oppositions such as meaning/form, soul/body, intuition/expression, literal/metaphorical, nature/culture transcendental/emperical, the superior term belongs to the logos and is a higher presence, the inferior term marts a fall"— In South Asian mystic thought, on the other hand, the individual consciousness and Collective Consciousness are two sides of the same coin. The relation between the two is that of a drop of water with the ocean. Both are "water". The opposition is a mirage, born out of a fallacy in consciousness. So both concepts co_exist creating a linkage and not a confrontation. It was Iqbal who deviated from this time_old stance and for the first time in Urdu literature, juxtaposed the concept of individual consciousness (which he called 'Khudi') to the concept of 'Be-Khudi'— a sort of collective Consciousness.

اس میں میرا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اقبال نے مغربیت کے اس تصور کو تو قبول کیا جو فرد کی انفرادیت کا علم بردار تھا مگر پھر اسے اجتماعیت سے منسلک کر کے فرد اور معاشرے کے ایک نئے رشتے کو سامنے لانے کی کوشش بھی کی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے 'خودی' کے تصور کو اس کے رائج مفہوم سے الگ کر کے انفرادیت کے معنوں میں برتا اور اسے مغربیت کے تصور سے منسلک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تاہم انہوں نے مغربی فکر کی تقلید میں اسے کوئی عام سی سطح تفویض کرنے کے بجائے ایک تخلیقی سطح عطا کر دی اس طرح 'بے خودی' کے مفہوم کو بھی ضم ہونے' کھو جانے' جذب ہو جانے کی بجائے جاگنے اور روبرو کھڑے ہو کر بیداری کائنات کا مظاہرہ کرنے کی صورت میں پیش کیا جو

اصلاً ایک تخلیقی زاویہ تھا۔

مندرجہ بالا معروضات سے یہ بات مترشح ہے کہ اقبال نے مغربی فکر کے اثرات کے راستے میں کوئی بند نہیں باندھا تاہم مغربی فکر کو اس کی رائج صورت میں قبول بھی نہیں کیا۔ ہمیشہ انہوں نے مغربی فکر کو قلب ماہیئت کے عمل سے گزارنے کے بعد ہی قبول کیا۔ افسوس کہ ہم نے اقبال کے اس عام انداز فکر کو بھلا دیا ہے۔ ہم ایک طرف تو مغربی تہذیب کو اندھا دھند قبول کرنے میں جت گئے ہیں اور دوسری طرف مغربی فکر کو اس کے ریپر سمیت قبول کرنے لگے ہیں۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اس معاملے میں اقبال کے طریق کار کو اپنائیں اور مغربی فکر کو مشرقی دانش سے ہم آہنگ کریں۔ خودی اور بے خودی کا یہی رشتہ اقبال کو پسند تھا۔ یہی رشتہ ہمیں بھی عزیز ہونا چاہیے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006